جسارت کا موقف: معذرت خواہانہ جدیدیت کا شاہکار

کیا جمہوریت کے بچھڑے کا ذبیحہ اب بھی ضروری نہیں؟

۹رفروری ۲۰۰۶ء کو روزنامہ جسارت نے ایک اداریہ تحریر کیا جس کا عنوان تھا ''حدود سے متعلق قوانین پر حملہ'' یہ اداریہ من وعن درج کیا جارہا ہے۔

ایک ایسے وقت میں جب کہ پورا عالم اسلام توہین رسالت کی وارداتوں کی اذیت سے گزر رہا ہے، اسلامی جمہوریہ پاکستان میں قرآن وسنت سے ماخوذ حدود کے قوانین پر بھرپور حملہ کیا گیا ہے۔اس سلسلے میں منگل کے روز قومی اسمبلی میں حدود کے قوانین منسوخ کرنے کا بل بحث کے لیے منظور کرلیا گیا، اس حوالے سے سرکاری مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی متحد ہوگئے جب کہ متحدہ مجلس عمل اور نواز لیگ نے بل کی مخالفت کی اور اجلاس سے واک آؤٹ کیا۔ کچھ عرصہ قبل ایسا ہی ایک بل متحدہ قومی موومنٹ نے پیش کیا تھا، تاہم اس وقت حکومت اور اس کے اتحادی کامیاب نہیں ہوسکے، تاہم اب حکومت اس کے اتحادی اور پیپلز پارٹی متحد ہوگئے ہیں۔

موجودہ منظرنامے میں بل پیش کیے جانے کا عمل اور اس کی منظوری یقیناً عالمی تناظر کی حامل ہے اور اس کے یہ معنی بعید از قیاس نہیں کہ یورپ اور امریکا میں توہین رسالت ہورہی ہے تو اس سے بہتر بات کیا ہوگی کہ اسلامی جمہوریت پاکستان میں قرآن وسنت سے ماخوذ قوانین کو چیلنج اور منسوخ کیا جائے۔ یہ بہ اندازِ دیگر قرآن وسنت کی تعلیمات پر حروف گیری ہی کی ایک صورت ہے۔ بلاشبہ بل پیش اور منظور کرنے والے پہلے بھی حدود قوانین کی مخالفت کرتے رہے ہیں، لیکن ان میں اتحاد کی جو صورت اس وقت دیکھنے میں آرہی ہے وہ پہلے کبھی نہیں تھی۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ ویسے جنرل پرویز، پیپلز پارٹی، ایم کیو ایم اور سرکاری مسلم لیگ میں بڑے جھگڑے ہیں لیکن قرآن وسنت سے ماخوذ قوانین ایسی حقیقت ہیں جن کے حوالے سے ان میں کامل اتحاد ہے، اس اتحاد کی جڑیں یقیناً امریکا اور یورپ میں پیوست ہیں، یہ صورت حال صرف دینی طبقات کے لیے نہیں پوری قوم کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ اسلامی قوانین کا دفاع اگر اسلامی جمہوریہ پاکستان میں نہیں ہوسکتا تو پھر پوری دنیا

میں ہم کہیں بھی اسلامی تصورات کا تحفظ نہیں کرسکیں گے۔

[کیا ہی اچھا ہوتا کہ مذکورہ بل پیش اور منظور کرانے والے پہلے ملک کو فوجی آمریت سے نجات دلا لیتے۔آئین اور پارلیمینٹ کی بالادستی بحال کرالیتے۔ جمہوریت کی جڑوں کو مضبوط کرلیتے اور پھر ایک بہتر فضاء میں اس امر پر بحث کرلیتے کہ حدود آرڈیننس کی ترمیم کی ضرورت ہے یا نہیں، مگر بل پیش کرنے والوں کو کچھ یاد آیا بھی تو حدود آرڈیننس جو مغرب کے ایجنڈے کے سوا کچھ نہیں۔]

روزنامہ جسارت جماعت اسلامی پاکستان کا سرکاری ترجمان ہے اور اس کا اداریہ جماعت اسلامی کی سرکاری حکمت عملی کا اظہار کرتا ہے۔ اداریے کی آخری سطور کا بغور مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوجاتا ہے کہ فروری ۲۰۰۶ء تک جماعت اسلامی کا اصل مسئلہ اور جماعت اسلامی کی نظر میں ملک وملت کے لیے زندگی اور موت کا معاملہ حدود قوانین کی منسوخی کا معاملہ نہیں بلکہ فوجی آمریت سے چھٹکارا، آئین کی بالادستی، جمہوریت کی مضبوطی اور پیپلز پارٹی سے سیاسی اتحاد کے ذریعے جنرل پرویز مشرف کی حکومت کا خاتمہ تھا۔ اداریے کے یہ الفاظ ناقابل معافی الفاظ ہیں کہ ''کیا ہی اچھا ہوتا کہ مذکورہ بل پیش کرنے والے پہلے ملک کو فوجی آمریت سے نجات دلا لیتے، آئین پارلیمینٹ کی بالادستی بحال کرالیتے، پھر ایک بہتر فضاء میں اس امر پر بحث کرلیتے کہ حدود آرڈیننس کی ترمیم کی ضرورت ہے یا نہیں'' گویا حدود آرڈیننس میں ترمیم کرنے کا بل پیش کرنے والے واقعتاً نفاذ حدود کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے یہ بل پیش کررہے تھے لیکن اس وقت اس کا موقع نہیں تھا موقع تو جنرل مشرف کو ہٹانے کا تھا جسے بل کی آمد نے روک دیا۔ جماعت اسلامی کا اور دینی تحریکوں کا یہی طرز عمل ہے جسے ساحل بار بار نرم سے نرم اور کم سے کم الفاظ میں معذرت خواہانہ جدیدیت کے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔

جمہوری عمل میں شرکت کے نتیجے میں نظریاتی جدوجہد پس منظر میں مل جاتی ہے اور آخر کار اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ دنیا بھر کی تاریخ اس مؤقف کی گواہ ہے۔ یورپ میں تمام سوشلسٹ جماعتیں جمہوریت اور سوشل ویلفیئر ازم کے سحر میں مبتلا ہوئیں تو یہ سب کی سب سرمایہ دارانہ نظام میں تحلیل ہوگئیں۔آج جرمنی سے لے کر فرانس تک سوشلسٹ پارٹیاں دم توڑ چکی ہیں۔ٹریڈ یونین سرمایہ داری کا ضمیمہ دم چھلہ اور تتمہ بن کر اپنی موت آپ مرچکی ہیں۔ جمہوریت مغرب کا وہ طلسمی طوطا ہے جس میں مغربی تہذیب وفلسفہ جدید سائنس وٹیکنالوجی کے تمام کمالات پوشیدہ ہیں۔لہٰذا جمہوریت پر ایمان لانے والا دراصل مغربیت جدیدیت پر ایمان لے آتا ہے اور رفتہ رفتہ اپنے ایمان سے دستبردار ہوجاتا ہے، یہ دستبرداری اتنے خاموش اور باعزت طریقے سے ہوتی ہے کہ اپنے ایمان سے دستبردار ہوجانے والے کو بھی اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔ صدر بش نے دوسری معیاد کے لیے اپنی تقرری کے موقع پر تقریر میں صاف لفظوں میں کہا تھا کہ ''امریکہ دنیا کے تاریک غاروں کے اندر بھی جمہوریت کی شمع روشن کرے گا اور فریڈم کا سفر جاری رہے گا؟ آخر کیوں جمہوریت اور فریڈم یعنی کیپٹل ازم وہ ''زندہ طلسمات'' ہے جو

مغربی تہذیب کے ہر رنگ کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یورپ کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جمہوری عمل اور سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ بننے کے نتیجے میں تمام نظریاتی سوشلسٹ جماعتیں رفتہ رفتہ اس نظام میں تحلیل ہو کر اس نظام کا حصہ بن گئیں اور سرمایہ دارانہ علمیت کے عالمی آفاقی غیر اقداری اور سب سے زیادہ موثر ہونے پر ایمان لے آئیں۔ روس کا خاتمہ بھی سرمایہ دارانہ نظام کی فتح تھی اور چین کی نظریاتی اساس کمیونزم، ماؤازم کے نظریاتی حصار کو بھی سرمایہ دارانہ نظام نے تہس نہس کر دیا ہے۔

متحدہ مجلس عمل اور محترم قاضی حسین احمد کی سیاست جمہوری عمل کے تضادات کی ہی توجیہہ ہے۔

گزشتہ چار برسوں سے صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان میں صوبائی حکومتوں میں شامل ہونے کے باوجود مجلس عمل اور قاضی حسین احمد نے صرف کھونے کی سیاست کی ہے پانے کی نہیں، مجاہدین اور طالبان کے لہو نے انھیں کامیابی عطا فرمائی، لیکن مجاہدین کے لہو سے کھلم کھلا غداری کی گئی۔ انھیں ریاست کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ صوبہ سرحد میں آج تک مجاہدین پر ظلم و ستم کے خلاف نہ ہڑتال ہوئی نہ احتجاج ہوا۔ جمہوری عمل میں شرکت کا یہ لازمی نتیجہ تھا۔ صوبہ سرحد کے سینئر وزیر سراج الحق نے مجاہدین پر ظلم و ستم کے خلاف احتجاجاً استعفیٰ دے دیا تو فوری طور پر لیاقت بلوچ کی وضاحت آگئی کہ استعفیٰ پہلے سے طے شدہ تھا کیونکہ دو عہدے نہ رکھنے پر اتفاق ہو گیا تھا۔ جمعیت العلمائے اسلام کے اراکین نے احتجاجاً استعفیٰ اسپیکر کو بھیجنے کے بجائے اپنے امیر کو ارسال فرمائے۔ محترم قاضی حسین احمد کی سیاست کے عجیب و غریب رخ ہیں چند سال پہلے آپ نے بے نظیر بھٹو کے استقبال کے لیے جماعت اسلامی کے پچاس ہزار کارکنوں کی پیش کش کی تھی۔ جمہوریت کی خاطر پرویز مشرف کی وردی برداشت کی گئی جب اعتماد کا ووٹ لے لیا گیا تو ایم ایم اے کو اس کی حیثیت یاد دلا دی گئی۔ قاضی صاحب نے فرمایا تھا کہ ہم سے غلطی ہوئی ہم استعفیٰ دے دیں گے لیکن استعفیٰ کی دھمکی دیتے دیتے اپنے موقف اور پینترے بدلتے چلے گئے کہ اب لوگ اس لفظ کو ان کے دہن مبارک سے سن کر ہنسی ضبط کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ پہلے کہا گیا کہ استعفیٰ دیں گے پھر کہا کہ وقت نہیں آیا پھر کہا کہ پیپلز پارٹی اتحاد نہیں کر رہی، اس کی وجہ سے استعفیٰ روکے ہوئے ہیں۔ یعنی استعفیٰ کی راہ میں رکاوٹ پیپلز پارٹی ہے پھر فیصلہ ہو گیا اور عمل میں تاخیر ایم ایم اے نے کی حتیٰ کہ قاضی حسین صاحب نے ایم ایم اے سے مستعفی ہونے کا عندیہ ظاہر کیا۔ پھر فیصلے سے انحراف ہو گیا کہ اگر استعفے دے دیئے گئے تو حکومت کو من مانی ترامیم کا اختیار مل جائے گا۔ کیا یہ بات پہلے معلوم نہ تھی؟ اب ایم ایم اے اقتدار کی سیاست کی اتنی عادی ہو گئی ہے کہ استعفیٰ دینا محال نظر آتا ہے۔ یہ رویہ جمہوری عمل کا لازمی نتیجہ ہے اس لیے صدر بش تاریک غار میں بھی جمہوریت کی شمع روشن کرنا چاہتے ہیں تاکہ اسلامی تحریکوں اور اسلامی جماعتوں کے بچے کھچے درویش اگر ان غاروں میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہوں تو جمہوریت کی شمع سے استفادہ کر لیں اور قاضی حسین احمد کے جمہوری قافلے میں شریک ہو جائیں جو گزشتہ پچاس برس سے شکست پر شکست کھا رہا ہے مگر اسے آج بھی فتح کا مکمل یقین

ہے۔جمہوریت صحراء کا سراب ہے۔ یہ وہ دھوکہ ہے جس کی تاثیر سے صحرا کا مسافر پانی کی آرزو میں زندگی بھر چلتا رہتا ہے نہ تھکتا ہے نہ گھبراتا ہے، نہ ڈرتا ہے نہ جھلاتا ہے، بار بار گرتا ہے لیکن جب ہاتھ جھاڑ کر اٹھتا ہے تو اسے اقتدار کا محل بگولے میں بھی نظر آتا ہے۔

جمہوری سیاست کا انجام مصلحت مصالحت پسپائی اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ پوری دنیا کی تاریخ خصوصاً مشرقی یورپ، یورپ اور اسلامی تحریکوں کی انتخابی جدوجہد کی تاریخ جمہوریت کے انہی تلخ ثمرات کی تصدیق کرتی ہے۔ پچاس برس کی جمہوری سیاست مذہبی جماعتوں کو بار بار متنبہ کر رہی ہے، لیکن اس سحر سے باہر آنا ممکن ہی نہیں۔ اب قاضی حسین احمد نے نئی بات کی ہے فرمایا ہے کہ انقلاب کے بغیر اسلام نہیں آسکتا لیکن صرف خوبصورت باتیں انقلاب نہیں برپا کرسکتیں۔ انقلاب حاضر و موجود نظام سے بے زاری کا نام ہے۔ انقلاب اس بات کا نام ہے کہ قدیم، بوسیدہ، گلے سڑے نظام کو حکمت عملی سے تہس نہس کر دیا جائے۔ اس کے آہنی پنجرے کو ریزہ ریزہ کر دیا جائے۔ اس کی علامات اس کے ادارے مٹا دیے جائیں لیکن قاضی صاحب کے یہاں اس بات کا کوئی شعور نہیں ملتا کہ انقلاب کس کے خلاف برپا کیا جائے گا۔ جب تک دشمن معلوم نہ ہو انقلاب کا کیا سوال؟ اگر وہ پرویز مشرف کو ہٹانا انقلاب سمجھتے ہیں تو یہ پرانی غلطی کا نیا اعادہ ہوگا۔ انقلاب نظام ملک کو جرابوں کی طرح الٹا دینے کا نام ہے۔ اگر وہ انقلابی ہیں، انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں تو انھیں سرمایہ داری نظام، اس کی جدید سائنس، ٹیکنالوجی، صنعت اس کے اداروں، اس کی اصطلاحات، اس کی علامات کے خلاف منظم روحانی انقلاب برپا کرنا ہوگا۔ یہ انقلاب کئی سطحوں پر برپا کیا جائے گا اس کے لیے ایک مضبوط مستحکم حکمت عملی کی ضرورت ہے اور نہایت پاکیزہ کردار، استقامت، اور روحانیت کی ضرورت ہے۔ افسوس یہ کہ دینی جماعتوں میں مادیت کا غلبہ بڑھ رہا ہے اور روحانیت انحطاط کے درجے تیزی سے طے کر رہی ہے۔ اسلامی تحریکوں کے ذمہ داروں کی نماز تہجد کا کیا حال ہے۔ سحر خیزی کی روایت کتنی مستحکم ہے، دنیا سے تمتع کی صورت حال کیا ہے؟ روحانی تغیر کے بغیر کیا مادی تغیر کوئی اثر پیدا کرسکتا ہے؟ روحانیت کے ارتقاء کے بغیر انقلاب برپا نہیں ہوسکتا۔ اگر ہو بھی جائے تو وہ محض مادی انقلاب ہوگا جو دلوں کی دنیا بدلنے سے محروم رہے گا لیکن انقلاب کی پہلی منزل دشمن کا شعور، دشمن کے فکر و فلسفے ہتھیاروں سے آگاہی اور جلد بازی و نعرہ بازی سے مکمل گریز ہے۔ کیا قاضی حسین صاحب ان مراحل کے لیے تیار ہیں؟ اگر وہ تیار ہیں تو سب سے پہلے انتخابی بچھڑے کی قربانیں فرمادیں جو سامری کے بچھڑے کی طرح اسلامی جماعتوں کے دل میں گھر کر چکا ہے۔ ان کو یہ بات بھی طے کر لینی چاہیے کہ قومی پارلیمنٹ کے انتخابات میں اکثریت حاصل کرنے سے انقلاب برپا نہیں ہو جاتا۔ انقلاب مکمل شکست و ریخت کا نام ہے کہ قدیم ادارے اسلوب کو الٹ دیا جائے اور نیا جہاں تعمیر کیا جائے۔ شاید قاضی صاحب کو یاد نہ ہو کہ ایرانی انقلاب کے بعد تہران یونیورسٹی تین سال تک بند رکھی گئی تا کہ نیا نصاب تعلیم تیار کیا جائے۔ یہ دوسری بات ہے کہ نیا نصاب بھی کوئی انقلابی نصاب نہیں تھا،

لیکن ایک اچھی خواہش کی عملی کوشش تو تھی۔ اگر قاضی صاحب اسی نظام کی لیپا پوتی سے مغربی اداروں کی اسلام کاری سے اسلامی نظام کا سورج طلوع ہوتا دیکھ رہے ہیں تو یہ ان کی شدید غلط فہمی ہے۔ روزنامہ جسارت میں امان اللہ شادیزئی کے انقلابی مضمون یقیناً قاضی حسین احمد صاحب کی اجازت سے شائع ہو رہے ہیں لیکن یہ مضامین محض کارکنان کو مطمئن کرنے کی پرانی کوشش ہیں جن سے وقتی طور پر یہ تاثر پیدا کیا جاتا ہے کہ قیادت انقلابی ہوگئی ہے اور انقلابی راستے ڈھونڈ رہی ہے لہٰذا اس وقت تک جمہوری راستے پر چلتے رہو جلد انقلاب کا راستہ بنا دیا جائے گا۔ ان کھلونوں سے نہ ماضی میں انقلاب برپا ہوا نہ مستقبل میں کسی انقلاب کا امکان ہے۔

متحدہ مجلس عمل کے صدر کی حیثیت سے قاضی صاحب کو وہ بیان یاد ہوگا جو ۲۰؍ اگست ۲۰۰۵ء کے قومی اخبارات میں شائع ہوا "دینی اسناد کے مسئلے پر ہمارے خلاف فیصلہ ہوا تو حکومت سے نہ ختم ہونے والی جنگ شروع ہو جائے گی" یعنی قومی و صوبائی اسمبلی میں ایم ایم اے کے اراکین کی رکنیت خطرے میں ہو تو حکومت سے جنگ ہوگی لیکن مجاہدین قتل ہوں، غیر ملکی مہمانوں کو بے دردی سے شہید کیا جائے، مساجد مسمار ہوں، ٹی وی چینل پر اسلام کا پیغمبر اسلام کا حدود کا مذاق اڑایا جا رہا ہو، میراتھن رلس کے ذریعے فسق و فجور کی کھلے عام دعوت دی جائے۔ پتنگ بازی سے سینکڑوں ماؤں کو سوگوار کر دیا جائے۔ جزائر کی تعمیر کے ذریعے فسق و فجور کے مراکز کے قیام کا اعلان ہو تو تب جنگ شروع نہیں ہوگی، جنگ اپنے مفادات سے وابستہ ہے۔ یہ وہ رویہ ہے جو جمہوریت پیدا کرتی ہے۔ جمہوری عمل میں شریک ہونے والے اتنی تیزی سے اپنی شناخت ساخت، ہیئت، سانچے، ڈھانچے، جسم روح، حقیقت، حیثیت، تاریخ، رویے، اسلوب اور طریقے بلکہ عقیدے تک بدل ڈالتے ہیں جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ایم ایم اے کی مثال اس قصائی کی ہے جسے بکرے سے محبت ہو جائے۔ جمہوریت کی گائے کے ذبیحے کے بغیر انقلاب برپا نہیں ہو سکتا۔ انقلاب کے برپا ہونے کے لیے شرک کی ہر علامت کا مٹنا ضروری ہے اور جمہوریت اس عہد کا سب سے بڑا شرک ہے۔ جو الکتاب کی جگہ کتاب دستور کو لاتا ہے۔ الٰہ العالمین کی جگہ الوہیت انسانی بذریعہ جمہور قائم کرتا ہے۔ امر بی کو پارلیمینٹ کے اجماع کا متبادل قرار دیتا ہے۔ حقوق العباد کی جگہ حقوق انسانی کی کافرانہ اصطلاحوں کو عالمگیر قرار دے کر تمام مذاہب عالم کا اصلاً، عقلاً، علماً اور عملاً انکار کر دیتا ہے اور کسی فرد، ملک، جماعت، گروہ کو جمہوریت، مساوات، آزادی کے تین مغربی خداؤں کے خلاف قانون سازی کی کسی حالت میں اجازت نہیں دیتا سو فی صد اکثریت بھی ان تین اقداری عقیدوں کے خلاف فیصلہ نہیں کر سکتی، کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم سو فیصد اکثریت کے ساتھ جمہوریت، آزادی اور مساوات کو رد کرتے ہیں۔ یہ ارتداد ہے جس کی سزا مغربی قانون میں قتل ہے۔ ہر وہ دین یا مذہب جو مذہب حقوق انسانی کی راہ میں مزاحم ہو مغرب اسے ختم کرنے کا اور قتل کرنے کا کھلم کھلا اعلان کرتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ قاضی حسین احمد، ایم ایم اے ابھی تک سنجیدگی سے جمہوریت کی مابعد الطبیعیات سمجھنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔

ساحل مارچ ۲۰۰۷ء